لب پہ آ سکتا نہیں

آنکھ سے گزرنے والا ہر جلوہ بیان میں نہیں آ سکتا جب آنکھ محو نظارہ ہو تو بیان ممکن نہیں ہوتا اور جب نظاری رخصت ہو جائے تو صحت بیان مشکوک سی ہو جاتی ہے اور بیان اپنی صداقت کے باوجود یقین اور بداعتمادی کے ملے جلے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ویسے بھی دیکھے ہوئے اور سنے ہوئے منظر میں فرق رہتا ہے۔

آنکھ اگر آنے والے دور کو دیکھے۔ تو اس کا بیان سامعین کے لیے الجھاؤ کا باعث ہو سکتا ہے۔ آنے والے زمانے کو کس نے دیکھا؟ سچ ہے۔ آنے والا تا غائب ہے اور غائب اگر نظر میں ہو تو تب بھی محو نظر ہے۔

آنے والے ایام آخر جانے والے ایام سے ہی تو جنم لیتے ہیں۔ اگر حال کو غور سے دیکھا جائے، تو استقبال کو قبل از وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی بوڑھا شخص بیمار رہنے لگ جائے تو مستقبل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ اگر جوانوں میں ہیروئن کا شوق اور عادت پیدا ہو جائے تو قوم کا مستقبل صاف ظاہر ہے۔

اگر طالب علم، علم کا طالب نہ رہے، تو نتیجہ واضح ہے۔

اگر قافلہ کسی کو سالار ہی نہ مانے، تو سفر گمراہی کی دلیل ہے۔ قافلے کی منزل وقت سے پہلے عیاں ہے۔

اگر میاں بیوی کے درمیان انا کے مقابلے اور مناظرے شروع ہو جائیں تو

اس گھر اور گھر کے افراد کا حشر غائب کا علم نہیں کہلاتا۔

اگر خوراک میں ملاوٹ شروع ہو جائے، تو صحت کے بارے میں سیمینار منعقد کرنا بیکار ہے۔ صحت کا علم وقت سے پہلے معلوم ہو سکتا ہے۔

اگر رشوت لینے والے محفوظ مرتبوں پر فائز ہوں، تو مستقبل۔۔۔ کیسا مستقبل!

اگر چوکیدار ہی چوری کرنے لگ جائیں، اگر باڑ ہی کھیت کو کھانے لگ جائے، اگر ایمپائر ہی غیر جانبدار نہ رہیں، تو مستقبل عیاں ہوتا ہے۔

اگر کسی کو کسی پر اعتماد نہ ہو، اگر کوئی کسی کے لیے بے ضرر نہ ہو، اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص پر، اس کی نیت پر شبہ ہو، اگر انسان اپنے آپ سے بے زار ہو، اگر الفاظ اپنے معنی سے جدا ہو جائیں تو مستقبل کے بارے میں جاننا غیب کی بات نہیں، ظاہر کا علم ہے۔ اگر سیاست اختلاف برائے اختلاف پر مبنی ہو تو سیاسی استحکام کا مستقبل آشکار سا ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اور اسی طرح کی کئی باتیں، ظاہر ہے ہر ذی شعور کے لیے اپنے اندر آنے والے زمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔

کبھی کبھی حالاتِ حاضرہ کے مشاہدے کے بغیر بھی مستقبل اپنے آنے کی قبل از وقت اطلاع دیتا ہے۔ اقبالؔ نے کہا کہ ''محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی'' تو اس خبر کا تعلق حال سے قطعاً نہیں۔ یہ الگ اطلاع ہے۔ اس کا تعلق نظر سے ہے۔

مقام خبر اور مقام نظر کا فرق تو صرف اہل باطن ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ اہل باطن کی نظر میں اپنے زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ

وجوہات اور نتائج کے رشتے انسانی رشتوں کی طرح ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ بعض اوقات وجہ کچھ اور ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ اور۔

بے سبب نتائج کی خبر ہی نظر کہلاتی ہے۔ صاحب نظر نقیب فطرت ہوتا ہے۔ فطرت اسے جو کچھ دکھاتی ہے، وہ اسے بیان کرتا ہے۔ وہ صاف صاف بیان کرتا ہے، لیکن سننے والے سمجھ نہیں سکتے۔ سامعین حیران ہوتے ہیں کہ اس نے کون سا اخبار پڑھ لیا ہے یہ شخص بہک تو نہیں گیا۔ لیکن نہیں۔ وہ بہکتا نہیں۔ فطرت بہکنے والوں کے ذریعہ سے کوئی پیغام نہیں بھیجتی۔ یوں بھی جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں فرق رہتا ہے۔ اسی طرح جس طرح جاگنے والوں اور سونے والوں میں فرق ہے۔

ہر دور میں جاننے والوں نے نہ جاننے والوں کو اپنے علم سے متعارف کرایا ہے۔ سننے والوں کو یقین آئے نہ آئے، یہ الگ بات ہے۔

فی الحال اس سے بحث نہیں۔ یقین اگر اہل نظر کی بات کی تصدیق سے پہلے آئے تو بہتر، ورنہ بیکار۔ اگر حادثہ گزر جائے تو یقین کا فائدہ ہی کیا؟ مثلاً اگر کوئی بتانے والا یہ بتائے کہ سانپ آ رہا ہے تو اس سے پہلے کہ بتانے والے کی تحقیق کی جائے، بہتر یہی ہے کہ سانپ کا تدارک کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ خبر صحیح تھی یا غلط۔۔۔ دونوں حالتوں میں ہم محفوظ رہتے ہیں!

اگر ہم مسلمانانِ پاکستان اپنی حالت کا مسلمانانِ عالم کے پس منظر میں جائزہ لیں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آیئے غور کریں کہ دنیا کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان کس حال میں ہیں؟ وطن میں غریب الوطن!

ایران کس حال سے گزر گیا عراق کس حال میں ہے اور ہمارا پڑوسی مسلمان افغانستان کس صورت حال سے دوچار ہے؟ لبنان، فلسطینی مسلمان، امریکہ کے مسلمان۔ سب پر کیا مسلط ہے۔

ہمیں اپنی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہم ایک خطہء امن بنے ہوئے ہیں۔۔۔ ہم گوشہء عافیت میں ہیں۔۔۔ سوال یہ ہے کہ کیوں اور کب تک؟

ہم میں کیا خصوصیت ہے؟ کیا ہم بہت ہی لاڈلے ہیں؟ ہماری حالت باقی مسلمانوں کی حالت سے مختلف کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری باری آنے والی ہو اور ہم بے خبر اپنے حال میں مگن ہوں۔۔۔ بس یہی ہے وہ خبر، جیسے نظر کہا جا سکتا ہے!!

اب ہمارا عمل بدلنا چاہیے، ورنہ ہم بھی کسی ناخوشگوار واقعہ کی نظر ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں زلزلے آ رہے ہیں اور ہم بھی دنیا میں رہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، لیکن ایسے ہو تو سکتا ہے۔

خدا نہ کرے کہ کوئی جنگ ہو۔ لیکن ہر روز کی خبریں، بار بار جنگ کے امکانات کا ذکر۔۔۔ جھوٹ ہو اللہ کرے۔۔۔ لیکن اگر سچ ہو تو؟ اندرونی خلفشار طاقت نے دبا رکھا ہے۔ اگر خدا نہ کرے کوئی لاوا ابل پڑے۔۔۔ تو۔۔۔ کیا ہوگا؟

ہماری سرحدوں کی حالت تشویشناک نہیں، لیکن تسلی بخش بھی تو نہیں ایسی

حالت میں کچھ بھی کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو،لیکن ہوتو سکتا ہے!

آنے والا زمانہ جانے والے زمانے سے مختلف بھی ہوسکتا ہے۔غور کیا جائے۔۔۔اگر ہمارے ساتھ خدانخواستہ کوئی ایسا ویسا واقعہ یا حادثہ ہوگیا،تو ہمارے لیے جائے مفر نہیں۔ہم ہر طرف سے محصور ہیں۔

ہمیں اپنے دامن میں ایسا کام بھی تو نظر نہیں آتا،جس سے ہم کسی ناگہانی سے محفوظ رہنے کا حق حاصل کریں۔ہمیں اللہ پر بھروسہ ہے اور اللہ سب مسلمانوں کا بھی تو اللہ ہے اب مستقبل کا دارومدار صرف اخوت پر ہی ہوسکتا ہے اور شومئی قسمت کہ ہم میں اخوت ہی تو نہیں۔

ہمیں صرف گفتگو،لائحہ عمل،صرف بیانات سے آگے نکلنا چاہیے ہمیں علم سے نکل کر عمل کے میدان میں اترنا چاہیے۔وحدت عمل،وحدت کردار۔۔۔یہی اور صرف یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہے۔

شاعر ملتِ اسلامیہ اقبالؔ نے جب یہ کہا کہ ع

وطن کی فکر کر ناداں،مصیبت آنے والی ہے

تو اس کا مخاطب کوئی بھی زمانہ ہوسکتا ہے۔اور ہوسکتا ہے کہ ہمارا ہی زمانہ ہو اہل نظر شاعر کی نگاہ سے زمان و مکاں کے حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں وہ اپنے زمانے سے کسی بھی زمانے کو کوئی سا پیغام دے سکتا ہے۔اقبال دیکھ رہا تھا،آنے والوں کو۔۔۔جانے والوں کو۔۔۔اقبالؔ کی زبان سے بولنے والی کوئی بھی ذات ہوسکتی ہے۔

اقبال خود کہتا ہے:

ع نکلی تو لبِ اقبال سے ہے نہ جانے ہے یہ کس کی صدا

تو۔۔۔غور کا مقام ہے۔۔۔بڑے غور کا مقام ہے

ہمارے اندیشے اتنے بے سبب بھی نہیں۔آنے والا دور اتنا خوشگوار بھی نہیں کہ ہم غفلت میں ہی اس کا انتظار کریں۔

ہوسکتا ہے۔۔۔اور بہت کچھ ہوسکتا ہے!!

اگر اینٹوں میں وحدت نہ رہے،تو دیوار اپنے بوجھ سے گر بھی سکتی ہے۔

تقریریں،مذہبی اور سیاسی،صرف تقریریں،صرف خطابات،بیانات اور صرف الفاظ سے قوم کی تاریخ مستحکم نہیں ہوا کرتی۔قومیں عمل پیہم سے بنتی ہیں۔ ہمارا قومی عمل کیا ہے؟ہم جس درخت کے سائے میں بیٹھے ہیں،جس کا پھل کھا رہے ہیں،اسی درخت کی قدر نہیں کرتے۔اس کی حفاظت کے لیے متحد نہیں ہوتے۔ہم کیا کرتے ہیں؟

اگر سورج کی کرنیں سورج ہی کو چاٹ لیں تو کیا ہوگا؟اگر الفاظ کی بے معنی کثرت الفاظ کی حرمت ختم کردے تو کیا ہوگا؟اگر مساجد کی تعداد بڑھ جائے اور نمازیوں کی تعداد کم ہوجائے تو کیا ہوگا؟

اگر قوم میں قوتِ بازو بھی نہ ہو اور قوتِ ایمان بھی نہ ہو،تو کیا ہوگا؟

اگر آدھا رستہ طے کرنے کے بعد مسافر بد دل ہو جائیں تو کیا ہوگا

؟۔۔آگے جانے کا عزم نہ رہے اور پیچھے کو لوٹنا ممکن نہ ہو تو کیا ہوگا؟

اگر زمین پر گناہوں کا بوجھ بڑھ جائے۔۔۔اگر مکان اپنے مکینوں سے نالاں ہوں۔۔۔اگر انسانوں کا اپنا باطن ان کے اپنے ظاہر سے پریشان ہو، ۔۔۔تو کیا ہوگا؟

اگر شاعر، ادیب، دانشور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں، تو ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا؟

اگر ہم آپس میں مہربان نہ ہوں، تو دشمن کے مقابلے میں متحد کیسے ہوں گے؟

اگر بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لے۔۔۔تو کیا ہوگا؟ اگر سچے دین کی تبلیغ کرنے والے خود سچے ہوں، تو تبلیغ کی تاثیر کیا ہوگی؟

اگر غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کا ذکر کرنے والے اپنے نوکروں کے ساتھ بدسلوکی کریں۔۔۔تو نتیجہ کیا ہوگا؟

اگر غفلت اور خوش فہمی اور خوش اعتمادی کی وجہ سے ایک دفعہ ملک ٹوٹ چکا ہو اور قوم کے مزاج اور عمل میں فرق نہ آیا ہو۔۔۔تو غور کا مقام ہے۔

اگر۔۔۔اور یہ بہت بڑا اگر ہے۔۔۔کہ

اگر دین خوشنودی رسول اور خوشنودی خدا کا نام ہو اور خدا اور مصطفیٰ ہم پر راضی نہ ہوں۔۔۔تو۔۔۔ہم کدھر جائیں گے؟

اب اس مقام پر کسی پیش گوئی اور کسی بحث کے تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہ ابتلا کا وقت ہے۔

کیا ہم غور کرنے کی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ماضی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا ہم دوسرے مسلمان ممالک سے سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے کو معاف کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے سے معافی مانگ سکتے ہیں؟

کیا ہم حق بات کہنے کی جرات کر سکتے ہیں؟

کیا مشائخ اکرام واقعی متحد ہو سکتے ہیں؟

کیا علماء ایک مسلک پر متفق ہو سکتے ہیں؟

کیا سیاست دان سچ اور صرف سچ بول سکتے ہیں؟

کیا طاقت، خوف کی بجائے محبت پیدا کر سکتی ہے؟

کیا آج کے بچوں کو آنے والے زمانوں کے خوشگوار ہونے کی گارنٹی دی جا سکتی ہے؟

کیا آئندہ کسی ٹوٹ پھوٹ کے نہ ہونے کا یقین ہو سکتا ہے؟

کیا ہم پرانے زخموں کے لیے مرہم تیار کرر ہے ہیں یا کسی نئے زخم کا انتظار کرر ہے ہیں؟

اس سے پہلے کہ ہم پر رحمت اور توبہ کے دروازے بند ہوں، کیا ہم اپنی فکر اور زندگی کو بدل سکتے ہیں؟

کیا ہم دشمن کی چال سے بے خبر ہیں؟۔۔دشمن کی اصل قوت دوستوں کی جدائی میں ہے۔کیا ہم اتنا اسلام بھی نہیں رکھتے، جتنا قائداعظمؒ کے پاس تھا؟اس صاحبِ ایمان کے پاس صرف صداقت تھی، جذبہ تھا، دیانت تھی، خلوص تھا۔بس یہی کچھ تو تھا انہوں نے نہ کسی سے کلمہ سنا، نہ کسی کو قرآن سنایا۔انہوں نے صرف مسلمانوں کے لیے، ان کی فلاح کے لیے، ان کی اپنی حکومت کے لیے، ایک مملکت بنا کر دیکھادی۔اعجاز ہے۔۔۔اور ہم اس مملکت میں کیا کیا کر چکے ہیں۔۔۔کیا کیا کرر ہے ہیں۔ہم یقیناً جواب دہ ہیں۔شہدائے وطن کے سامنے، خدا کے سامنے، اور پھر حضورؐ کے سامنے!بات علم کی نہیں عمل کی ہے، خالص عمل۔۔۔ہم سب ایک کشتی میں سوار ہیں، ایک امت ہیں، بحث کی ضرورت نہیں۔۔۔غور کا مقام ہے۔۔۔دعا کی گھڑی ہے۔۔۔کہ خدا کرے کہ وہ واقعہ ہی ٹل جائے۔۔۔جس کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔وہ واقعہ ہی ایسا ہے کہ لب پہ آ سکتا نہیں۔